

تفہیم القرآن

(۲۴)

یونس

(از وسط رکوع اتار رکوع ۴۴)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں، اور جو لوگ ہماری نشانیں سے غافل ہیں، اُن کا آخری ٹھکانا جہنم ہو گا اُن برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ (اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرز عمل کی وجہ سے) کرتے رہے

اے یہاں پھر دعویٰ کے ساتھ ساتھ اس کی دلیل بھی اشارۃً بیان کر دی گئی ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ عقیدہ آخرت کے انکار کلامی اور قطعی نتیجہ جہنم ہے اور دلیل یہ ہے کہ اس عقیدے سے منکر یا ظالی الذہن ہو کر انسان اُن برائیوں کا اکتساب کرتا ہے جن کی پاداش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے اور ہزار ہا سال کے انسانی معیہ کا تجربہ اس پر شاہد ہے جو لوگ خدا کے سامنے اپنے آپ کو ذمہ دار اور جواب دہ نہیں سمجھتے، جو اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے کہ انہیں آخر کار خدا کو اپنے پورے کارنامہ حیات کا حساب دینا ہے، جو اس مفروضے پر کام کرتے ہیں کہ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے، جن کے نزدیک دنیا دنیا کا مادی کامیابی کا معیار صرف یہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی نے کس قدر خوشحالی، آسائش، شہرت اور طاقت حاصل کی، اور جو اپنے اپنی مادی و مادی تخیلات کی بنا پر آیات الہی کو ناقابلِ توجہ سمجھتے ہیں، ان کی پوری زندگی غلط فکر و باقی ہے، وہ دنیا میں شتر بے بہار بن کر رہتے ہیں، نہایت برے اخلاق و اوصاف کا اکتساب کرتے ہیں، خدا کی زمین کو ظلم و فساد اور فسق و فجور سے بھر دیتے ہیں، اور اس بنا پر جہنم کے مستحق بن جاتے ہیں۔

یہ عقیدہ آخرت پر ایک اور نوعیت کی دلیل ہے۔ پہلی تین دلیلیں عقلی استدلال کے قبیل سے تھیں، اور یہ تجربی استدلال کے قبیل سے ہے۔ یہاں اسے صرف اشارۃً بیان کیا گیا ہے، مگر قرآن میں مختلف مواقع پر ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا انفرادی، اور انسانی گروہوں کا اجتماعی رویہ کبھی اس وقت تک درست نہیں ہوتا جب (باقی صفحہ ۱۲۶ پر)

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے (یعنی جنہوں نے اُن صداقتوں کو قبول کر لیا جو اس کتاب (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵) تک یہ شعور اور یہ یقین انسانی سیرت کی بنیاد میں پیوست نہ ہو کہ ہم کو خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ اب غور طلب یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اس شعور و یقین کے غائب یا کمزور ہوتے ہی انسانی سیرت و کردار کی گامی بُرائی کی راہ پر چل پڑتی ہے؟ اگر عقیدہ آخرت حقیقت نفس الامری کے مطابق نہ ہوتا اور اُس کا انکار حقیقت کے خلاف نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس اقرار و انکار کے یہ نتائج ایک لازمی شان کے ساتھ مسلسل ہمارے تجربے میں آتے۔ ایک ہی چیز سے یہ صحیح نتائج کا برآمد ہونا اور اس کے عدم نتائج کا ہمیشہ غلط ہو جانا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ چیز، بجائے خود صحیح ہے۔

اس کے جواب میں بسا اوقات یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ بہت سے منکرین آخرت ایسے ہیں جن کا فلسفہ اخلاق اور دستورِ عمل مسامردہریت و مادہ پرستی پر مبنی ہے پھر بھی وہ اچھی خاصی پاک سیرت رکھتے ہیں اور ان سے ظلم و فساد اور فسق و فجور کا ظہور نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے معاملات میں نیک اور خلقِ خدا کے خدمت گزار ہوتے ہیں۔ لیکن اس استدلال کی کمزوری بادیں شامل واضح ہو جاتی ہے۔ تمام مادہ پرستانہ لادینی فلسفوں اور نظامات فکر کی جانچ پڑتال کر کے دیکھ لیا جائے۔ کہیں اُن اخلاقی خوبیوں اور عملی نیکیوں کے لئے کوئی بنیاد نہ ملے گی جن کا خراجِ تحسین ان ”یکوکار“ دہریوں کو دیا جاتا ہے کسی منطق سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ ان لادینی فلسفوں میں راست بازی، امانت، دیانت، وفائے عہد، عدل، رحم، فیاضی، ایثار، ہمدردی، ضبطِ نفس، عفت اور حق شناسی وادائے حقوق کے لئے محرکات موجود ہیں۔ خدا اور آخرت کو نظر انداز کر دینے کے بعد اخلاق کے اگر کوئی قابلِ عمل نظام بن سکتا ہے تو وہ صرف افادیت (Utilitarianism) کی بنیادوں پر بن سکتا ہے، باقی تمام اخلاقی فلسفے محض فرضی اور کتابی ہیں نہ کہ عملی۔ اور افادیت جو اخلاق پیدا کرتی ہے اسے خواہ کتنی ہی وسعت دی جائے، بہر حال وہ اس سے آگے نہیں جاتا کہ آدمی وہ کام کرے جس کا کوئی فائدہ اس دنیا میں اُس کی ذات کی طرف، یا اُس معاشرت کی طرف جس سے وہ تعلق رکھتا ہے، پہلٹ کر آنے کی توقع ہو۔ یہ وہ چیز ہے جو فائدے کی امید اور نقصان کے اندیشے کی بنا پر انسان سے بچ اور مچھوٹ، امانت اور خیانت، ایمانداری اور بے ایمانی، وفادار و غدار، انصاف اور ظلم، غرض ہر نیکی اور اس کی ضد کا حسبِ موقع ارتکاب کر سکتی ہے۔ ان اخلاقیات کا بہترین نمونہ موجودہ زمانہ کی انگریز قوم ہے جس کو اکثر اس امر کی مثال میں پیش کیا جاتا ہے کہ مادہ پرستانہ نظریہ حیات رکھنے اور آخرت کے تصور سے نالی ہونے کے باوجود اس قوم کے افراد بالعموم دوسروں سے زیادہ سچے، کھرے، دیانتدار، عہد کے پابند،

میں پیش کی گئی ہیں) اور نیک اعمال کرتے رہے انہیں اُن کا رب اُن کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ چلائے گا۔
نعمت بھری جنتوں میں ان کے نیچے نہریں بہیں گی، وہاں ان کی صدایہ ہوگی کہ ”پاک ہے تو اے خدا“

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶) انصاف پسند اور معاملات میں قابل اعتماد ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افادی اخلاقیات کی ناپائیداری کا سب سے زیادہ نمایاں ثبوت ہم کو اسی قوم کے کردار میں ملتا ہے۔ اگر فی الواقع انگریزوں کی سچائی ”انصاف پسندی“ راستہ بازی اور مہد کی پابندی اس یقین و اعلان پر مبنی ہوتی کہ یہ صفات بجا ہے خود مستقل اخلاقی خوبیاں ہیں تو آخر یہ کس طرح ممکن تھا کہ ایک ایک انگریز تو اپنے شخصی کردار میں ان کا حامل ہوتا مگر ساری قوم مل کر جن لوگوں کو اپنا نمائندہ ادا اپنے اجتماعی امور کا سربراہ کرتا ہے وہ بڑے ہیماٹے پر اس کی سلطنت اور اس کے بین الاقوامی معاملات کے چلانے میں علانیہ مجبوت، بدعہد، ظلم، بے انصافی اور بددیانتی سے کام لیتے اور پوری قوم کا اعتماد ان کو حاصل رہتا، کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ یہ لوگ مستقل اخلاقی قدروں کے قائل نہیں ہیں بلکہ دنیوی فائدے اور نعمان کے لحاظ سے بیک وقت دو متضاد اخلاقی رویے اختیار کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں؟ — تاہم اگر کوئی منکر خدا و آخرت ایسا ہے جو مستقل طور پر بعض نیکیوں کو پابند اور بعض بدیوں سے مجتنب ہے تو درحقیقت اس کی یہ نیکی اور پرہیزگاری اس کے مادہ پرستانہ نظریہ حیات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اُن مذہبی اثرات کا نتیجہ ہے جو غیر شعوری طور پر اس کے نفس میں ممکن ہیں۔ اس کا اخلاقی سرمایہ مذہب سے چھڑایا ہوا ہے اور اس کو وہ مادہ طریقے سے لاندہ ہی میں استعمال کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی لاندہ ہی و مادہ پرستی کے خزانے میں اس سرمایے کے ماتخذ کی نشان دہی ہرگز نہیں کر سکتا۔

(حاشیہ صفحہ ۱۲۸) اس جملے پر سے سرسری طور سے نہ گزر جائیے۔ اس کے مضمون کی ترتیب گہری توجہ کی مستحق ہے:
ان لوگوں کو آخرت کی زندگی میں جنت کیوں ملے گی؟ — اس لیے کہ وہ دنیا کی زندگی میں سیدھی راہ چلے ہر کام میں، ہر شعبہ زندگی میں، ہر انفرادی و اجتماعی معاملے میں انہوں نے برحق طریقہ اختیار کیا اور باطل طریقوں کو چھوڑ دیا۔
یہ ہر قدم پر زندگی کے ہر موڑ اور ہر دور پر، اُن کو صحیح اور غلط، حق اور باطل، راست اور ناراست کی تمیز کیسے حاصل ہوئی؟ اور پھر اس تمیز کے مطابق راست روی پر ثبات اور کج روی سے پرہیز کی طاقت انہیں کہاں سے ملی؟ — ان کے رب کی طرف سے، کیونکہ وہی علمی، رہنمائی اور عملی توفیق کا منبع ہے۔

ان کا سب انہیں یہ ہدایت اور یہ توفیق کیوں دیتا رہا؟ — ان کے ایمان کی وجہ سے۔
(باقی صفحہ ۱۲۸ پر)

ان کی دعا یہ ہوگی کہ ”سلامتی ہو“ اور ان کی تان ٹوٹے گی تو اس بات پر کہ ”ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لئے ہے“۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۷) یہ نتائج جو اوپر بیان ہوئے ہیں کس ایمان کے نتائج ہیں؟ — اُس ایمان کے نہیں جو محض مان لینے کے معنی میں ہو، بلکہ اُس ایمان کے جو سیرت و کردار کی روح بن جائے اور جس کی طاقت سے اخلاق و اعمال میں صلاح کا ظہور ہوئے لگے۔ جس طرح جسمانی زندگی میں آپ دیکھتے ہیں کہ بقائے حیات، تندرستی، قوتِ کار اور لذتِ زندگی کا حصول صحیح قسم کی غذا پر موقوف ہے، لیکن یہ نتائج اُس تغذیہ کے نہیں ہیں جو محض کھا لینے کے معنی میں ہو بلکہ اس تغذیہ کے ہیں جو ہضم ہو کر خون بنے اور رگ رگ میں پہنچ کر ہر حصہ جسم کو وہ طاقت بخشنے جس سے وہ اپنے حصے کا کام ٹھیک ٹھیک کر لے لگے، اسی طرح اخلاقی زندگی میں بھی ہدایتِ یابی، راستِ بہنی، راستِ روی اور بالآخر فلاح و کامیابی کا حصول صحیح عقائد پر موقوف ہے، مگر یہ نتائج اُن عقائد کے نہیں ہیں جو محض زبان پر جاری ہوں یا دل و دماغ کے کسی گوشے میں بے کار پڑے ہوئے ہوں بلکہ ان عقائد کے ہیں جو نفس کے اندر جذب و پیوست ہو کر اندازِ فکر اور مذاقِ طبع اور افتادِ مزاج بن جائیں اور سیرت و کردار اور رویہ زندگی کی صورت میں نمایاں ہوں۔ خدا کے قانونِ طبیعی میں وہ شخص جو کھا کر نہ کھانے والے کی طرح رہے، اُن انعامات کا مستحق نہیں ہوتا جو کھا کر ہضم کرنے والے کے لئے رکھے گئے ہیں۔ پھر کیوں توقع کی جائے کہ اس کے قانونِ اخلاقی میں وہ شخص جو مان کر نہ ماننے والے کی طرح رہے اُن انعامات کا مستحق ہو سکتا ہے جو مان کر صالح بننے والے کے لئے رکھے گئے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ۱۲۸) لہٰذا یہاں ایک لطیف انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کے دارالامتحان سے کامیاب ہو کر نکلنے اور نعمت بھری جنتوں میں پہنچ جانے کے بعد یہ نہیں ہوگا کہ یہ لوگ بس وہاں پہنچتے ہی سامانِ عیش پر بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑیں گے اور ہر طرف سے لاؤ خوریں، لاؤ شراب اور بچے چنگ و رباب کی صدائیں بلند ہونے لگیں گی، جیسا کہ جنت کا نام سنتے ہی بعض کج فہم حضرات کے ذہن میں اس کا نقشہ گھومنے لگتا ہے، بلکہ درحقیقت صالح اہل ایمان دنیا میں افکارِ عالیہ اور اخلاقِ فاضلہ اختیار کر کے اپنے جذبات کو سنوار کر، اپنی خواہشات کو سدھار کر، اور اپنی سیرت و کردار کو پاکیزہ بنا کر جس قسم کی بلند ترین شخصیتیں اپنی ذات میں بہم پہنچائیں گے وہی دنیا کے ماحول سے مختلف، جنت کے پاکیزہ ترین ماحول میں اور زیادہ نکھر کر ابھرائیں گی اور ان کے وہی اوصاف، جو دنیا میں انہوں نے پرورش کئے تھے وہاں اپنی پوری شان کے (باقی صفحہ ۱۲۹ پر)

اگر کہیں اللہ لوگوں کے ساتھ برا معاملہ کرنے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی وہ ان کے ساتھ بھلائی کرنے میں جلدی کرتا ہے تو ان کی مہلت عمل کبھی کی ختم کر دی گئی ہوتی (مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے) اس لئے ہم ان لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لئے چھوٹ دے دیتے ہیں۔ انسان کا حال یہ ہے کہ جب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۸) ساتھ ان کی سیرت میں جلوہ گر ہوں گے۔ ان کا محبوب ترین مشغلہ وہی اللہ کی حمد و تقدیس ہو گا جس دنیا میں وہ مانوس تھے، اور ان کی سوسائٹی میں وہی ایک دوسرے کی سلامتی چاہنے کا جذبہ کار نما ہو گا جسے دنیا میں انہوں نے اپنے اجتماعی رویے کی روح بنایا تھا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لہٰذا اوپر کے تہید ہی فقروں کے بعد اب نصیحت اور تفہیم کی تقریر شروع ہوتی ہے۔ اس تقریر کو پڑھنے سے پہلے اس کے پس منظر سے متعلق دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں:

ایک یہ کہ اس تقریر سے تھوڑی ہی مدت پہلے سات سال کا وہ مسلسل اور سخت بلا انگیز قحط ختم ہوا تھا جس کی مصیبت سے اہل مکہ چیخ اٹھے تھے اس قحط کے زمانے میں قریش کے منکبرین کی اکثری ہوئی گردیں بہت جھک گئی تھیں۔ دعائیں اور زاریاں کرتے تھے، بت پرستی میں کمی آگئی تھی، خدا سے واحد کی طرف رجوع برپہ کیا تھا، اور نوبت یہ آگئی تھی کہ آخر کار ابوسفیانؑ نے اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ خدا سے اس بلا کو ٹالنے کے لئے دعا کریں۔ مگر جب قحط دور ہو گیا، بارشیں ہونے لگیں اور خوشحالی کا دور آیا تو ان لوگوں کی وہی سرکشیاں اور بد اعمالیاں، اور دین حق کے خلاف ان کی وہی سرگرمیاں پھر شروع ہو گئیں اور جو دل خدا کی طرف رجوع کرنے لگے تھے وہ پھر اپنی سابق غفلتوں میں ڈوب گئے۔

دوسرے یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ان لوگوں کو انکار حق کی پاداش سے ڈرانے لگے تو یہ لوگ جواب میں کہتے تھے کہ تم جس عذاب الہی کی دھمکیاں دیتے ہو وہ آخر اکیوں نہیں جاتا۔ اس کے آنے میں دیر کیوں لگ رہی ہے؟ اسی پر فرمایا جا رہا ہے کہ خدا لوگوں پر رحم و کرم فرمانے میں جتنی جلدی کرتا ہے ان کو سزا دینے اور ان کے گناہوں

پر پکڑ لینے میں اتنی جلدی نہیں کرتا۔ تم چاہتے ہو کہ جس طرح اس نے تمہاری دعائیں سن کر بلائے قحط جلدی سے دور کر دی، اسی طرح وہ تمہارے چیلنج سن کر اور تمہاری سرکشیوں دیکھ کر عذاب بھی فوراً بھیج دے۔ لیکن خدا کا طریقہ یہ نہیں ہے لوگ خواہ کتنی ہی سرکشیاں کیئے جائیں وہ ان کو پکڑنے سے پہلے شیطانی کا کافی موقع دیتا ہے، یہ ہم تنبیہات بھیجتا ہے اور ڈھیلی رستی پھوٹے رکھتا ہے، یہاں تک کہ جب رعایت کی حد ہو جاتی ہے تب پاداش عمل کا قانون (باقی صفحہ ۱۳۰ پر)

اس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے، مگر جب ہم اس کی مصیبت ٹال دیتے ہیں تو ایسا پل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی بُرے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اس طرح حدت گذرنے والوں کے لیے اُن کے کرتوت خوشنا بنا دیئے گئے ہیں۔ لوگو! تم سے پہلے کی قوموں کو (جو اپنے اپنے زمانہ میں برسرِ عروج تھیں) ہم نے ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور اُن کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے، تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۹) نافذ کیا جاتا ہے۔ یہ تو ہے خدا کا طریقہ۔ اور اس کے برعکس کم ظرف انسانوں کا طریقہ وہ ہے جو تم نے اختیار کیا کہ جب مصیبت آئی تو خدا یا د آئے لگا، بلبلا نا اور گڑگڑانا شروع کر دیا، اور جہاں راحت کا دور آیا کہ سب کچھ بھول گئے۔ یہی وہ لچن ہیں جن سے قومیں اپنے آپ کو عذابِ الہی کا مستحق بناتی ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) لے اصل میں لفظ ”قرن“ استعمال ہوا ہے جس سے مراد عام طور پر تو عربی زبان میں ایک ”عہد“ کے لوگ ہوتے ہیں، لیکن قرآن مجید میں جس انداز سے مختلف مواقع پر اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ”قرن“ سے مراد وہ قوم ہے جو اپنے دور میں برسرِ عروج اور کُلّی یا جزئی طور پر امامتِ عالم پر سرفراز رہی ہو۔ ایسی قوم کی ہلاکت نہ مآبہ ہی معنی نہیں رکھتی کہ اس کی نسل کو بالکل غارت ہی کر دیا جائے، بلکہ اس کا مقام عروج و امامت سے گرا دیا جانا، اس کی تہذیب و تمدن کا تہاہ ہو جانا، اس کے تشخص کا مٹ جانا اور اس کے اجزاء کا پارہ پارہ ہو کر دوسری قوموں میں گم ہو جانا بھی ہلاکت کی ایک صورت ہے۔

لے یہ لفظ ظلم ان محدود معنوں میں نہیں ہے جو عام طور پر اس سے مراد لیتے جاتے ہیں، بلکہ یہ ان تمام گناہوں پر حاوی ہے جو انسان بندگی کی حد سے گزر کر کرتا ہے۔ تشریح کے لئے ملاحظہ ہوں حواشی سورہ بقرہ رکوع ۴۔

لے خیال رہے کہ خطابِ اہل عرب سے ہو رہا ہے۔ اور ان سے کہا یہ جا رہا ہے کہ پچھلی قوموں کو اپنے اپنے زمانہ میں کام کرنے کا موقع دیا گیا تھا، مگر انہوں نے آخر کار ظلم و بغاوت کی روش اختیار کی اور جو بنیاد ان کو راہِ راست دکھانے کے لیے بھیجے گئے تھے ان کی بات انہوں نے نہ مانی، اس لیے وہ ہمارے امتحان میں ناکام ہوئیں اور میدان سے ہٹا دی گئیں۔ اب اے اہل عرب تمہاری باری آتی ہے۔ تمہیں ان کی جگہ کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تم اس امتحان گاہ میں کھڑے ہو جسے (باقی صفحہ ۱۳۱ پر)

جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی۔ تو میں تو دلوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ ”اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو“ اے محمدؐ ان سے کہو ”میں اپنی طرف سے کوئی تغیر و تبدل کرنے کا اختیار نہیں رکھتا، میں تو بس اُس فرمان کا تابع ہوں جو وحی کے ذریعہ سے مجھ کو بھیجا جاتا ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے“

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۰)۔ تمہارے پیش رو کا کام ہو کر نکالے جا چکے ہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارا انجام بھی وہی ہو جو ان کا ہوا تو اس مذبح سے جو تمہیں دیا جا رہا ہے، صحیح فائدہ اٹھاؤ، پچھلی قوموں کی تاریخ سے سبق لو اور ان غلطیوں کا اعادہ نہ کرو جو ان کی تباہی کی موجب ہوئیں۔

(حواشی صفحہ ۱۷۱)۔ اے اُن کا یہ قول اقل تو اس معذرت پر مبنی تھا کہ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ پیش کر رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ ان کے اپنے دماغ کی تعصیف ہے اور اس کو خدا کی طرف منسوب کر کے انہوں نے صرف اس لئے پیش کیا ہے کہ ان کی بات کا وزن بڑھ جائے۔ دوسرے ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ تم نے توحید اور آخرت اور اخلاق پر باندیوں کی بحث کیا چھیڑ دی، مگر رہنمائی کے لئے اُسٹھے ہو تو کوئی ایسی چیز پیش کرو جس سے قوم کا بھلا ہو اور اس کی دنیا بنی نظر آئے۔ اہم اگر تم اپنی اس دعوت کو بالکل نہیں بدلنا چاہتے تو کم از کم اس میں اتنی لچک پیدا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کم و بیش پر مصالحت ہو سکے۔ کچھ تم ہماری مانیں، کچھ تم ہماری مانو۔ تمہاری توحید میں کچھ ہمارے شرک کے لئے، تمہاری خدا پرستی میں کچھ ہماری نفس پرستی اور دنیا پرستی کے لئے اور تمہارے عقیدہ آخرت میں کچھ ہماری ان دینوں کے لئے بھی گنجائش چاہیے کہ یہ میں ہم جو چاہیں کرتے۔ میں آخرت میں کسی کی سنی و سفارش اور کسی کے دامن سے، بیشی ہم کو نجات دلا دے گی۔ اسی طرح تمہارے یہ قطعی اور حتمی اخلاقی اصول بھی ہمارے لئے ناقابل قبول ہیں۔ ان میں کچھ ہمارے تعصبات کے لئے، کچھ ہمارے رسم و رواج کے لئے، کچھ ہماری شخصی اور قومی اغراض کے لئے اور کچھ ہماری خواہشات نفس کے لئے بھی جگہ بھرتی چاہیے کیوں نہ ایسا جو کہ دین کے مطالبات کا ایک مناسب دائرہ ہماری اور تمہاری رضامندی سے طے ہو جائے اور اس میں ہم خدا کا حق ادا کر دیا کریں پھر ہمیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس طرح اپنی دنیا کے کام چلانا چاہتے ہیں چلائیں۔ مگر تم تو یہ غنیمت کر رہے ہو کہ پوری زندگی کچھ اور سارے معاملات کو توحید و آخرت کے عقیدے اور شریعت کے ضابطہ سے کس دینا چاہتے ہو۔

لئے یہ ادھر کی دونوں باتوں کا جواب ہے۔ اس میں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں بلکہ (باقی صفحہ ۱۳۲ پر)

اور کہو "اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا کہ میں یہ قرآن تمہیں سناؤں تو میں کبھی نہ سنا سکتا تھا بلکہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دے سکتا تھا" آخر اس سے پہلے میں ایک عمر مختار سے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۱) یہ وحی کے ذریعہ میرے پاس آئی جسے جس میں کسی رد و بدل کا مجھے اختیار نہیں۔ اور یہ بھی کہ اس معاملہ میں مصالحت کا قطعاً کوئی امکان نہیں، قبول کرنا ہو تو اس پورے دین کو جوگ توں قبول کرو ورنہ پورے کو رد کرو۔

(حاشیہ صفحہ ۱۳۱) یہ ایک زبردست دلیل ہے اُن کے اس خیال کی تردید میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو خود اپنے دل سے گھر کر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعوے کی تائید میں کہ وہ خود اس کے معنی نہیں ہیں بلکہ خدا کی طرف سے بندید وحی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو پھر نہایت اذکر کی چیز تھے، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو اُن کے لئے قریب ترین چیز تھی۔ آپ نے نبوت سے پہلے پورے چالیس سال ان کے درمیان گزارے تھے۔ ان کے شہر میں پیدا ہوئے، ان کی آنکھوں کے سامنے بچپن گزارا، جوان ہوئے، اوجھڑ عمر کو پہنچے۔ رہنا سہنا، ملنا جلتنا، دین و دنیا، شادی بیاہ، غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق اپنی کے ساتھ تھا اور آپ کی زندگی کا کوئی پہلو ان سے چھپا ہوا نہ تھا۔ ایسی جانی بوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی۔ آپ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنہیں مکہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا:

ایک یہ کہ نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپ نے کوئی ایسی تعلیم، تربیت اور صحبت نہیں پائی جس سے آپ کو وہ معلومات حاصل ہوئیں جن کے پختہ یکایک دعوائے نبوت کے ساتھ ہی آپ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس پہلے بھی آپ اُن مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے، ان مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے، اور ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے جو اب قرآن کی ان پے در پے سورتوں میں زیر بحث آ رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گھر سے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپ کی باتوں اور آپ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اُس عظیم نشان دعوت کی تمہید کہا جاسکتا ہو جو آپ نے اچانک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ خارج سے آپ کے اندر آتی ہوئی چیز ہے اس لئے کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشوونما اور ارتقاء کے واضح نشانات اُس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے بعض بوٹیاہ لوگوں نے جب خود محسوس کر لیا کہ قرآن (باقی صفحہ ۱۳۳ پر)

پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے، یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پاسکتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۶) کو آپ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک نوا الزام ہے تو آخر کو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو محمد کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے۔ لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ لغو تھی، کیونکہ مکہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر انہیں انگی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام کا مصنف ہے یا ہو سکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کیسے رہ سکتا ہے۔

دوسری بات جو آپ کی سابق زندگی میں بالکل نمایاں تھی، وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جعل، مکاری، عیاری اور اس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یکجائی معاشرت میں آپ سے کسی ایسی صفت کا تجربہ استہوا ہے۔ برعکس اس کے جن جن لوگوں کو بھی آپ سے سابقہ پیش آیا تھا وہ آپ کو ایک ہنریت سمجھتے تھے، دماغ، اور قابل اعتماد (ابن) انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجائش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی جھوٹ، جعل اور فریب سے کام نہ لیا۔ ایک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان جعل و فریب لے کر اٹھ کھڑا ہو کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کیں اور ان کو پورے زور اور تضحی کے ساتھ خدا کی طرف منسوب کر لے لگا۔ اسی بنا پر ان کے الزام کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کے بند، کچھ عقل سے تو کام لو، میں کوئی باہر سے آیا ہوا اجنبی آدمی نہیں ہوں، تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک عمر گزار چکا ہوں، میری سابق زندگی کو دیکھتے ہوئے تم کیسے یہ توقع مجھ سے کر سکتے ہو کہ میں خدا کی تعلیم اور اس کے حکم کے بغیر یہ قرآن تمہارے سامنے پیش کر سکتا تھا۔

(حواشی صفحہ ۱۳۶) لے یعنی اگر یہ آیات خدا کی نہیں ہیں اور میں انہیں نہ جانتا ہوں، مگر کے آیات الہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں تو مجھ سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔ اور اگر یہ واقعی اللہ کی آیات ہیں اور تم ان کو جھٹلاتے ہو تو پھر تم سے بڑا بھی کوئی ظالم نہیں۔

لے بعض نادان لوگ "فلاح" کو طویل عمر یا دینی خوشحالی، یا دینی فروغ کے معنی میں لیتے ہیں، اور اس اہمیت سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کر کے جیتا رہتا ہے یا یا میں پہلے چھوٹے، یا اس کی دعوت کو فروغ نصیب ہو (باقی صفحہ ۱۳۶ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۳) اسے نبی برحق مان لینا چاہیے کیونکہ اس نے فلاح پائی اگر وہ نبی برحق نہ ہوتا تو جھوٹا دعویٰ کرتے ہی مار ڈالا جاتا، یا جھوٹوں کو مار دیا جاتا اور دنیا میں اس کی بات چلنے ہی نہ پاتی۔ یہ احتمالہ استدلال صرف وہی کر سکتا ہے جو نہ تو قرآنی اصطلاح ”فلاح“ کا مفہوم جانتا ہو نہ اُس قانونِ اہمال سے واقف ہو جو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مجرموں کے لئے مقرر فرمایا ہے، اور نہ ہی سمجھتا ہو کہ اس سلسلہ بیان میں یہ فقرہ کس معنی میں آیا ہے۔

اول تو یہ بات کہ ”مجرم فلاح نہیں پاسکتے“ اس سیاق میں اس حیثیت سے فرمائی ہی نہیں گئی ہے کہ یہ کسی کے دعویٰ نبوت کو پرکھنے کا معیار ہے جس سے عام لوگ بچ کر خود فیصلہ کر لیں کہ جو دعویٰ نبوت فلاح پاسکا ہو اس کے دعوے کو مانیں اور جو فلاح نہ پاسکا ہو اس کا انکار کریں۔ بلکہ یہاں تو یہ بات اس معنی میں کہی گئی ہے کہ میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی، اس لئے میں خود تو یہ جرم نہیں کر سکتا کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کروں، البتہ تمہارے متعلق مجھے یقین ہے کہ تم بچے نبی کو جھٹلانے کا جرم کر رہے ہو اس لئے تمہیں فلاح نصیب نہیں ہوگی۔

پھر فلاح کا لفظ بھی قرآن میں دنیوی فلاح کے محض معنی میں نہیں آیا ہے، بلکہ اس سے مراد وہ پائیدار کامیابی ہے جو کسی خسران پر منتج ہونے والی نہ ہو، قطع نظر اس سے کہ دنیوی زندگی کے اس ابتدائی مرحلہ میں اس کے اندر کامیابی کا کوئی پہلو ہو یا نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک داعی ضلالت دنیا میں مزے سے جیسے خوب پھلے پھولے اور اس کی گمراہی کو بڑا فروغ نصیب ہو، مگر یہ قرآن کی اصطلاح میں فلاح نہیں، عین خسران ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک داعی حق دنیا میں سخت مصیبتوں سے دوچار ہو، شدتِ آلام سے نہ حال ہو کر یا ظالموں کی دست درازیوں کا شکار ہو کر دنیا سے جلدی رخصت ہو جائے، اور کوئی اسے مان کر نہ دے، مگر یہ قرآن کی زبان میں خسران نہیں، عین فلاح ہے۔

علاوہ بریں قرآن میں جگہ جگہ یہ بات پوری تشریح کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجرموں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کیا کرتا، بلکہ انہیں سنبھلنے کے لئے کافی مہلت دیتا ہے، اور اگر وہ اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اور زیادہ بگڑتے ہیں تو اللہ کی طرف سے ان کو ڈھیل دی جاتی ہے اور بسا اوقات ان کو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے نفس کی چھپی ہوئی تمام شرارتوں کو پوری طرح ظہور میں لے آئیں اور واقعات کی رو سے اس سزا کے مستحق بنیں جس کے وہ اپنی خواہشات کی رو سے فی الحقیقت مستحق ہیں پس اگر کسی جھوٹے مدعی کی رسی دراز ہو رہی ہو اور اس پر دنیوی فلاح کی برسات برس رہی ہو تو سخت غلطی ہوگی اگر اس کی اس حالت کو اس کے برسر ہدایت ہونے کی دلیل سمجھا جائے۔ خدا کا

(باقی صفحہ ۱۳۵ پر)

یہ لوگ اللہ کے سوا اُن کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے محمد! ان سے کہو ”کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں؟ پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔
ابنداء سارے انسان ایک ہی امت تھے، بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴) قانون اہمال و استدراج جس طرح تمام مجرموں کے لیے عام ہے اسی طرح جھوٹے مدعیانِ نبوت کے لیے بھی ہے اور ان کے اس تشکی ہوئے کی کوئی دلیل نہیں جو یہ غیر شیطانی کج قیامت کے لیے جو امت اللہ تعالیٰ نے وہی جہاں میں بھی یہ استثنائیں ذکر نہیں ہے کہ تیرے اور تیرے سات فریب چلنے والے جہاں تھے لیکن اگر تو اپنی طرف سے کوئی بھی گھر کرے گا تو یہ فریب نہ چلے دیا جائے گا۔
ممکن ہے کوئی شخص ہمارے اس بات کے جواب میں وہ آیت پیش کرے جو سورہ الحاقہ رکوع ۲ میں ارشاد ہوئی ہے کہ
وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأُمَانِ إِلَّا مَا وَدَّ اللَّهُ أَنْ لَا يَمُنَ إِلَّا بِرَبِّهِمْ ثُمَّ لَنَقَطَعَنَّهُمْ إِنْ كَذَّبُوا عَنْهُمْ - یعنی اگر محمدؐ نے خود گھڑ کر کوئی بات ہمارے نام سے کہی ہوتی تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ رگ کاٹ ڈالتے۔ لیکن اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ جو شخص فی الواقع خدا کی طرف سے نبی مقرر کیا گیا ہو وہ اگر جھوٹی بات گھر کر دے گی کی حیثیت سے پیش کرے تو فوراً پکڑا جائے۔ اس سے یہ استدلال کرنا کہ جو مدعی نبوت پکڑا نہیں جا رہا ہے وہ ضرور پچاسٹ ایک منطقی مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خدا کے قانون اہمال و استدراج میں جو استثناء اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے وہ صرف پچھتے نبی کے لیے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو شخص نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے وہ بھی اس قانون سے مستثنیٰ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سرکاری ملازموں کے لیے حکومت نے جو قانون بنایا ہو اس کا اطلاق صرف اپنی لوگوں پر ہوگا جو واقعی سرکاری ملازم ہوں۔ رہے وہ لوگ جو جعلی طور پر اپنے آپ کو ایک سرکاری عہدہ دار کی حیثیت سے پیش کریں، تو ان پر مضابطہ ملازمت کا نفاذ نہ ہوگا بلکہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائیگا جو دوسرے بد معاشوں اور مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں سورہ الحاقہ کی اس آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ بھی اس غرض کے لیے نہیں فرمایا گیا کہ لوگوں کو جی پر کھنے کا یہ معیار بتایا جائے کہ اگر پردہ غیب سے کوئی ہاتھ نمودار ہو کر اس کی رگ رگ دل اپنا ننگ کاٹ لے تو سمجھیں جھوٹا ہے ورنہ مان لیں کہ سچا ہے۔ نبی کے صادق یا کاذب ہونے کی جانچ اگر کسی سیرت اس کے کام، اور اُس چیز سے جو وہ پیش کر رہا ہو ممکن نہ ہوتی تو ایسے غیر معقول معیار تجویز کرنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔

(حاشیہ صفحہ ۱۳۵) اے کسی چیز کا اللہ کے علم میں نہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے، اس لیے کہ سب کچھ جو موجود ہے اللہ کے علم میں ہے۔ پس سفارشیوں کے معدوم ہونے کے لیے یہ ایک نہایت لطیف انداز بیان (باقی صفحہ ۱۳۶ پر)

بنائیے، اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات ملے نہ کرنی گئی ہوتی تو جس چیز میں وہ باہم اختلاف کر رہے ہیں اس کا فیصلہ کر دیا جاتا۔

اور یہ جو وہ کہتے ہیں کہ اس (خبر) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اُتاری گئی، تو ان سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۵) ہے کہ اللہ تعالیٰ تو جانتا نہیں کہ زمین یا آسمان میں کوئی اس کے حضور تمہاری سفارش کرنے والا ہے پھر یہ تم کن سفارشوں کی اس کو خبر دے رہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) لے اس مضمون کی تشریح سورہ بقرہ رکوع ۲۶ کے حواشی میں کی جا چکی ہے۔

لے یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ فیصلہ نہ کر لیا ہوتا کہ حقیقت کو انسانوں کے حواس سے پوشیدہ رکھ کر ان کی عقل و

فہم اور ضمیر و وجدان کو آزمائش میں ڈالا جائیگا اور جو اس آزمائش میں ناکام ہو کر غلط راہ پر جانا چاہیں گے انہیں اس راہ پر جانے اور چلنے کا موقع دیا جائے گا، تو حقیقت کو آج ہی بے نقاب کر کے سارے اختلافات کا فیصلہ کیا جاسکتا تھا۔

یہاں یہ بات ایک بڑی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے بیان کی گئی ہے عام طور پر آج بھی لوگ اس الجھن میں ہیں اور

نزول قرآن کے وقت بھی تھے کہ دنیا میں بہت سے مذاہب پائے جاتے ہیں اور ہر مذہب والا اپنے ہی مذہب کو حق سمجھتا ہے

ایسی حالت میں آخر اس فیصلے کی صورت کیا ہے کہ کون حق پر ہے اور کون نہیں۔ اس کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ یہ اختلاف

مذاہب دراصل بعد کی پیداوار ہے۔ ابتداء میں تمام نوع انسانی کا مذہب ایک تھا اور وہی مذہب حق تھا، پھر اس حق میں

اختلاف کر کے لوگ مختلف عقیدے اور مذاہب بناتے چلے گئے۔ اب اگر اس ہنگامہ مذاہب کا فیصلہ تمہارے نزدیک

مقل و مشور کے صحیح استعمال کے بجائے صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ خداوند حق کو بے نقاب کر کے سامنے لے آئے تو یہ

موجودہ دنیوی زندگی میں نہیں ہوگا، یہ تو امتحان گاہ ہے اور یہاں سارا امتحان ہے ہی اس بات کا کہ تم حق کو دیکھو بغیر

عقل و مشور سے پہچانتے ہو یا نہیں۔

لے یعنی اس بات کی نشانی کہ یہ واقعی نبی برحق ہے اور جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ بالکل درست ہے اس سلسلہ

میں یہ بات پیش نظر ہے کہ نشانی کے لئے ان کا یہ مطالبہ کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ وہ بچے دن سے دعوت حق کو قبول کر لے اور اس کے

مقاصد کے مطابق اپنے اخلاق کو، عادات کو، نظام معاشرت و تمدن کو، رخص اپنی پوری زندگی کو ڈھال لینے کے لئے

تیار تھے اور بس اس وجہ سے ٹھہرے ہوئے تھے کہ نبی کی تائید میں کوئی نشانی ابھی انہوں نے ایسی نہیں دیکھی تھی جس سے

(باقی صفحہ ۱۳۷ پر)

کہو "غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے، اچھا، انتظار کرو" میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔
لوگوں کا حال یہ ہے کہ مصیبت کے بعد جب ہم ان کو رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو فوراً ہی وہ ہماری
نشانیوں کے معاملہ میں چال بازیاں شروع کر دیتے ہیں۔ ان سے کہو اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ نیر ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۶) اس کی نبوت کا یقین آجائے۔ اصل بات یہ تھی کہ نشانی کا یہ مطالبہ محض ایمان نہ لانے کے لئے ایک
بہانے کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ جو کچھ بھی ان کو دکھایا جاتا اس کے بعد وہ یہی کہتے کہ کوئی نشانی تو ہم کو دکھائی ہی نہیں
گئی۔ اس لئے کہ وہ ایمان لانا چاہتے نہ تھے۔ دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو اختیار کرنے میں یہ جو آزادی ان کو حاصل
تھی کہ نفس کی خواہشات و رغبات کے مطابق جس طرح چاہیں کام کریں اور جس چیز میں لذت یا فائدہ محسوس کریں اس کے
پچھے لگ جائیں، اس کو چھوڑ کر وہ ایسی غیبی حقیقتوں (توحید و آخرت) کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے جنہیں مان لینے کے بعد
ان کو اپنا سارا نظام حیات مستقل اخلاقی اصولوں کی بندش میں باندھنا پڑ جاتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) اے یعنی جو کچھ اللہ نے اتارا ہے وہ تو میں نے پیش کر دیا، اور جو اس نے نہیں اتارا وہ میرے اور تمہارے لئے
"غیب" ہے جس پر سوائے خدا کے کسی کا اختیار نہیں، وہ چاہے تو اتارے اور نہ چاہے تو نہ اتارے۔ اب اگر تمہارا ایمان
لانا اسی پر موقوف ہے کہ جو خدا نے نہیں اتارا ہے وہ اترے تو اس کے انتظار میں بیٹھے رہو، میں بھی دیکھوں گا کہ تمہاری
یہ ضد پوری کی جاتی ہے یا نہیں۔

لے یہ پھر اسی قحط کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر دوسرے رکوع میں گذر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نشانی آخر
کس منہ سے مانگتے ہو۔ ابھی جو قحط تم پر گزرا ہے اس میں تم اپنے ان معبودوں سے مایوس ہو گئے تھے جنہیں تم نے اللہ
کے ہاں اپنا سفارشی ٹھکانہ رکھا تھا اور جن کے متعلق کہا کرتے تھے کہ فلاں آسمان کی نیاز تو تیر بہدف ہے، اور فلاں درگاہ
پر چڑھاوا پڑھانے کی دیر ہے کہ مراد بر آتی ہے۔ تم نے دیکھ لیا کہ ان نام نہاد خداؤں کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے اور سارے
اختیارات کا مالک صرف اللہ ہے۔ اسی وجہ سے تو آخر کار تم اللہ ہی سے دعائیں مانگنے لگے تھے۔ کیا یہ کافی نشانی نہ تھی
کہ تمہیں اس تعلیم کے برحق ہونے کا یقین آجاتا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو دے رہے ہیں؟ مگر اس نشانی کو دیکھ کر تم
لے کیا کیا؟ جوہنی کہ قحط دور ہوا اور باران رحمت نے تمہاری مصیبت کا خاتمہ کر دیا، تم نے اس بلا کے آنے اور پھر اس کے
دور ہونے کے متعلق ہزار قسم کی توجہیں اور تاویلیں (چال بازیاں) کرنی شروع کر دیں تاکہ توحید کو ماننے سے بچ سکو اور اپنے
(باقی صفحہ ۱۳۸ پر)

اُس کے فرشتے تمہاری سب مکاریوں کو قلم بند کر رہے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے، چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحان و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر بیکام بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھمیرے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اُس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اُس سے دُعائیں مانگتے ہیں کہ ”اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔“ مگر جب وہ ان کو پچالیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے مغرور ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ لوگو! تمہاری یہ بغاوت اُلٹی تمہارے ہی خلاف پڑ رہی ہے، دنیا کے چند روزہ مرے ہیں (ٹوٹ لو) پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے، اُس وقت تمہیں بتادیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔ دنیا کی یہ زندگی (جس کے نشے میں مست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار، جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب گھنی ہو گئی، پھر عین اُس وقت جبکہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں بیکام رات کو بادل کو (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۷) شرک پر جے ہو۔ اب جن لوگوں نے اپنے ضمیر کو اس درجہ خراب کر لیا ہوا نہیں آخر کو نئی نشانی دکھائی جائے اور اس کے دکھانے سے حاصل کیا ہے۔

(حواشی صفحہ ۱۳۷) اے اللہ کی چال سے مراد یہ ہے کہ اگر تم حقیقت کو نہیں مانتے اور اس کے مطابق اپنا رویہ درست نہیں کرتے تو وہ تمہیں اسی باغیانہ روش پر چلتے رہنے کی چھوٹ دے دیگا، تم کو جیتے ہی اپنے رزق اور اپنی نعمتوں سے نوازتا رہے گا جس سے تمہارا منہ زندگانی یونہی تمہیں مست کینے رکھے گا، اور اس مستی کے دوران میں جو کچھ تم کرو گے وہ سب اللہ کے فرشتے خاموشی کے ساتھ بیٹھے لکھتے رہیں گے، حتیٰ کہ اچانک موت کا پیغام آ جائے گا اور تم اپنے کرتوتوں کا مصاب دینے کے لئے دھر لیے جاؤ گے۔

لے یہ توحید کے برحق ہونے کی نشانی ہر انسان کے نفس میں موجود ہے۔ جب تک اسباب ساز مکار رہتے ہیں، انسان خدا کو ٹھہلا اور دنیا کی زندگی پر ٹھہلا رہتا ہے۔ جہاں اسباب نے ساتھ چھوڑا اور وہ سب سہارے جن کے بل پر جی رہا تھا ٹوٹ گئے، پھر کئے سے کئے مشرک اور سخت سے سخت دہریے کے قلب سے بھی یہ شہادت اُبلنی شروع ہو جاتی ہے کہ اس سارے (باقی صفحہ ۱۳۹ پر)

ہمارا حکم آگیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لئے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں۔ (تم اس ناپائیدار زندگی کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہو) اور اللہ تمہیں دارالسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے، (ہدایت اس کے اختیار میں ہے) جس کو وہ چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ان کے لئے بھلائی ہے اور مزید فضل، ان کے چہروں پر رویا ہی اور ذلت نہ چھائے گی، وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی بُرائی جیسی ہے ویسا ہی بدلہ وہ پائیں گے، ذلت ان پر مسلط ہوگی، کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہوگا، ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہوگی جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے ہوئے ہوں، وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے جس روز ہم ان سب کو ایک ساتھ (اپنی عدالت میں) اکٹھا کریں گے، پھر ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا ہے کہیں گے کہ ٹھیکر جاؤ تم بھی اور تمہارے ٹھیکر اٹھے ہوئے شریک بھی، پھر ہم ان کے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹا دیں گے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۸) عالم اسباب پر کوئی خدا کار فرما ہے اور وہ ایک ہی خدا ہے غالب و توانا ہے۔

(حواشی صفحہ ۱۳۸) ۱۔ یعنی دنیا میں زندگی بسر کرنے کے اُس طریقے کی طرف جو آخرت کی زندگی میں تم کو دارالسلام کا مستحق بنائے۔ دارالسلام سے مراد جنت ہے، اور اس کے معنی ہیں سلامتی کا گھر، وہ جگہ جہاں کوئی آفت، کوئی نقصان، کوئی رنج اور کوئی تکلیف نہ ہو۔

۲۔ یعنی ان کو صرف ان کی نیکی کے مطابق ہی اجر نہیں ملے گا بلکہ اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید انعام بھی بخشے گا۔ ۳۔ یعنی نیکو کاروں کے برعکس بدکاروں کے ساتھ معاملہ یہ ہوگا کہ جتنی بدی ہے اتنی ہی سزا دیدی جائے گی۔ ایسا نہ ہوگا کہ جرم سے ذرہ برابر بھی زیادہ سزا دی جائے۔

۴۔ وہ تاریکی جو مجرموں کے چہرے پر پکڑے جائے اور بچاؤ سے مایوس ہو جانے کے بعد چھاجاتی ہے۔

۵۔ متن میں قَرَبْنَا بَيْنَهُمُ الْفَافِ ہیں۔ اس کا مفہوم بعض مفسرین نے یہ لیا ہے کہ ہم ان کا باہمی ربط و تعلق

توڑ دیں گے تاکہ کسی تعلق کی بنا پر وہ ایک دوسرے کا لحاظ نہ کریں۔ لیکن یہ معنی عربی محاورے کے مطابق نہیں ہیں۔ محاورہ عربی کی رو سے اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے درمیان تمیز پیدا کر دیں گے، یا ان کو ایک دوسرے سے متمیز کر دیں گے (باقی صفحہ ۱۴۰ پر)

اور ان کے شریک کہیں گے کہ ”تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے، ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ (تم اگر ہماری عبادت کرتے بھی تھے تو ہم تمہاری اس عبادت سے بالکل بے خبر تھے)“ اس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزا چکھ لے گا، سب اپنے حقیقی مالک کی طرف پھیر دیے جائیں گے اور وہ سارے جھوٹ جو انھوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو جائیں گے۔

ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جان دار کو اور جان دار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو، پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے؟ تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے، پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹) اسی سنی کو ادا کرنے کے لیے ہم نے یہ طرز بیان اختیار کیا ہے کہ ”ان کے درمیان سے جہنیت کا پردہ ہٹا دیں گے“، یعنی مشرکین اور ان کے مبود آئے سامنے کھڑے ہوں گے اور دونوں گروہوں کی امتیازی حیثیت ایک دوسرے پر واضح ہوگی، مشرکین جان لیں گے کہ یہ ہیں وہ جن کو ہم دنیا میں مبود بنا ئے ہوئے تھے، اور ان کے مبود جان لیں گے کہ یہ ہیں وہ جنہوں نے ہمیں اپنا مبود بنا رکھا تھا۔

(حواشی صفحہ ۱۴۰) یعنی وہ تمام فرشتے، جن کو دنیا میں دیوی اور دیوتا قرار دے کر پوجا گیا، اور وہ تمام جن، ارواح، اسلاف، اجداد، انبیاء، اولیاء، شہداء وغیرہ جن کو خدائی صفات میں شریک ٹھہرا کر وہ حقوق انہیں ادا کیے گئے جو دراصل خدا کے حقوق تھے، وہاں اپنے پرستاروں سے صاف کہہ دیں گے کہ ہمیں تو خیر تک نہ تھی کہ تم ہماری عبادت بجالاؤ تمہاری کوئی دعا، کوئی التجائے امداد و اعانت، کوئی نذر و نیاز، کوئی چڑھاوے کی چیز، کوئی تعریف و مدح اور ہمارے نام کی جا پ، اور کوئی سجدہ ریزی و استسنا بوسی و درگاہ گروی ہم تک نہیں پہنچی۔

یعنی بے جان مادہ میں سے نئی حیات مخلوق کو، اور نئی حیات مخلوقات میں سے بے جان مادوں کو۔
یعنی اگر یہ سارے کام اللہ کے ہیں، جیسا کہ تم خود ماننے ہو، تب تو تمہارا حقیقی پروردگار، مالک، آفاک اور تمہاری بندگی و عبادت کا حق دار اللہ ہی ہوا۔ یہ دوسرے جن کا ان کاموں میں کوئی حصہ نہیں آخر زبست میں کہاں سے شریک ہو گئے۔

آخر تم یکدم پھر اُسے جارہے ہو؟ (اے نبی! دیکھو) اس طرح نافرمانی اختیار کرنے والوں پر تمہارے رب کی بات صادق آگئی کہ وہ مان کر نہ دیں گے۔

ان سے پوچھو، تمہارے پھر اُسے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہو اور پھر اس کا اعادہ بھی کرے؟ — کہ وہ صرف اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی، پھر تم یہ کس الٹی راہ پر چلائے جارہے ہو؟

لے خیال رہے کہ خطاب مام لوگوں سے ہے، اور ان سے سوال یہ نہیں کیا جا رہا ہے کہ تم کدھر پھرے جاتے ہو بلکہ یہ ہے کہ تم کدھر پھر اُسے جارہے ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی گمراہ کُن ہے جو لوگوں کو صحیح رُخ سے ہٹا کر غلط رُخ پر پھیر رہا ہے، اور لوگوں سے پل یہ کیا جا رہا ہے کہ تم اندھے بن کر غلط رہنمائی کرنے والوں کے پیچھے کیوں چلے جارہے ہو، اپنی گرد کی عقل سے کام لے کر سوچتے کیوں نہیں کہ جب حقیقت یہ ہے، تو آخر یہ تم کو کدھر چلایا جا رہا ہے۔ یہ طرز سوال جگہ جگہ ایسے مواقع پر قرآن میں اختیار کیا گیا ہے، اور ہر جگہ گمراہ کرنے والوں کا نام لینے کے بجائے ان کو صیغہ جہول کے پروے میں چھپا دیا گیا ہے، تاکہ ان کے مستحقین ٹھنڈے دل سے اپنے معاملہ پر غور کر سکیں، اور کسی کو یہ کہہ کر انھیں اشتعال دلائے اور ان کا دماغی توازن بگاڑ دینے کا موقع نہ ملے کہ دیکھو تمہارے بزرگوں اور پیشواؤں پر جو پیش کی جا رہی ہیں، اس میں حکمت تبیین کا ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے جس سے غافل نہ رہنا چاہیے۔

لے یعنی ایسی کھلی کھلی اور عام فہم دلیلوں سے بات سمجھائی جاتی ہے، لیکن جنھوں نے مانے کا فیصلہ کر لیا وہ اپنی ضد کی بنا پر کسی طرح مان کر نہیں دیتے۔ تخلیق کی ابتدا کے متعلق تو مشرکین مانے ہی تھے کہ یہ صرف اللہ کا کام ہے، ان کے شریکوں میں کسی کا اس کام میں کوئی حصہ نہیں۔ یہ تخلیق کا اعادہ تو ظاہر ہے کہ جو ابتدا پیدا کرنے والا ہے وہی اس عمل پیدائش کا اعادہ بھی کر سکتا ہے، مگر جو ابتدا ہی پیدا کرنے پر قادر نہ ہو وہ کس طرح اعادہ پیدائش پر قادر ہو سکتا ہے۔ یہ بات اگرچہ صریحاً ایک مقبول بات ہے، اور خود مشرکین کے دل بھی اندر سے اس کی گواہی دیتے تھے کہ بات بالکل ٹھکانے کی ہے، لیکن انھیں اس کا اقرار کرنے میں اس بنا پر تامل تھا کہ اسے ان لینے کے بعد انکار آخرت شکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر کے سوالات پر تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ خود کہیں گے کہ یہ کام اللہ کے ہیں، مگر یہاں اس کے بجائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوتا ہے کہ تم ان کے کی چوٹ کہو کہ یہ ابتداء سے خلق اور اعادہ خلق کا کام بھی اللہ ہی کا ہے۔

لے یعنی جب تمہاری ابتدا کا سراہی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور انتہا کا سراہی اسی کے ہاتھ میں، تو خود اپنے خیر خواہ بن کر ذرا سوچ کر آخر تمہیں یہ کیا ہو کر آیا جا رہا ہے کہ ان دونوں سروں کے بیچ میں اللہ کے سوا کسی اور کو تمہاری بندگیوں اور نیاز مندیوں کا حق پہنچ جاتا ہے۔

ان سے پوچھو تمہارے ٹھکانے ہوئے شرکیوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟
 کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر بھلا بتاؤ جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ
 مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو رہنمائی نہیں کر سکتا الایہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟ آخر تمہیں ہو کیا گیا
 کیسے اٹے اٹے فیصلے کرتے ہو۔

لے یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔ دنیا میں انسان کی ضرورتوں کا دائرہ صرف
 اسی حد تک محدود نہیں ہے کہ اس کو کھانے پینے، پہننے اور زندگی بسر کرنے کا سامان ہم پہنچے اور آفات، مصائب اور نقصانات سے محفوظ
 رہے، بلکہ اس کی ایک ضرورت (اور درحقیقت سب بڑی ضرورت) یہ بھی ہے کہ اسے دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ معلوم ہو اور وہ
 جلنے کو اپنی ذات کے ساتھ، اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے ساتھ، اُس سر و سامان کے ساتھ جو روئے زمین پر اس کے تصرف میں ہے، ان
 بے شمار انسانوں کے ساتھ جن سے مختلف حیثیتوں میں اس کو سابقہ پیش آتا ہے، اور مجموعی طور پر اُس نظام کائنات کے ساتھ جس کے ماتحت وہ کر
 ہی بہر حال اس کو کام کرنا ہے، وہ کیا اور کس طرح معاملہ کرے جس سے اس کی زندگی بحیثیت مجموعی کامیاب ہو اور اس کی کوششیں اور محنتیں
 غلط راہوں میں صرف ہو کر تباہی و بربادی پر منتج نہ ہوں۔ اسی صحیح طریقہ کا نام ”حق“ ہے اور جو رہنمائی اس طریقہ کی طرف انسان کو لے جائے
 وہی ”ہدایت حق“ ہے۔ اب قرآن تمام مشرکین سے اور ان سب لوگوں سے جو پیغمبر کی تعلیم کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، یہ پوچھتا ہے کہ تم خدا کے سوا
 جن جن کی بندگی کرتے ہو ان میں کوئی ہے جو تمہارے لیے ”ہدایت حق“ حاصل کرنے کا ذریعہ بنا ہو یا بن سکتا ہو؟ — ظاہر ہے کہ اس کا جواب
 نفی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسان خدا کے سوا جن کی بندگی کرتا ہے وہ دو بڑی اقسام پر منقسم ہیں:

ایک وہ دیویاں، جو تیرا اور زندہ یا مردہ انسان جن کی پرستش کی جاتی ہے۔ سوان کی طرف تو انسان کا رجوع صرف اس غرض کے
 ہوتا ہے کہ فوق انسانی طریقے سے اُس کی حاجتیں پوری کریں اور اس کو آفات بچائیں۔ یہی ہدایت حق، تو وہ نہ کبھی ان کی طرف سے آئی، نہ
 کبھی کسی مشرک نے اس کے لیے ان کی طرف رجوع کیا، اور نہ کوئی مشرک یہ کہتا ہے کہ اس کے یہ محبوب اسے اخلاق، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست،
 قانون، عدالت وغیرہ کے اصول سکھاتے ہیں۔

دوسرے وہ انسان جن کے بنائے ہوئے اصولوں اور قوانین کی پیروی و اطاعت کی جاتی ہے، سو وہ رہنما تو ضرور ہیں مگر سوال یہ
 کہ کیا فی الواقع وہ رہنمائے حق بھی ہیں یا ہو سکتے ہیں؟ کیا ان میں سے کسی کا علم بھی ان تمام حقائق پر حاوی ہے جن کو جاننے بغیر انسانی زندگی
 کے لیے صحیح اصول وضع نہیں کیے جا سکتے؟ کیا ان میں سے کسی کی نظر بھی اُس پورے دائرے پر پھیلتی ہے جس میں انسانی زندگی سے تعلق
 (باقی صفحہ ۴۸ پر)

حقیقت یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ محض قیاس و گمان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں، حالانکہ گمان علم حق کی ضرورت کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے۔ بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آچکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے، اس میں کوئی شک نہیں یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲) رکھنے والے مسائل پھیلے ہوئے ہیں، کیا ان میں سے کوئی بھی ان کمزوریوں سے، ان تصبیات، ان شخصی یا گروہی لحظوں سے، ان اغراض و خواہشات، اور ان رجحانات و میلانات کے بالاتر ہے جو انسان کی قوت فیصلہ کو لازماً متاثر کرتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی صحیح الدماغ آدمی ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا تو آخری لوگ "ہدایت حق" کا سرچشمہ کیسے ہو سکتے ہیں۔

اسی بنا پر قرآن یہ سوال کرتا ہے کہ لوگو! تمہارے ان مذہبی اور تمدنی معبودوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو راہ راست کی طرف تمہاری رہنمائی کرنے والا ہو؟ اوپر کے سوالات کے ساتھ مل کر یہ آخری سوال دین و مذہب کے پورے مسئلے کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ انسان کی ساری ضرورتیں دو ہی نوعیت کی ہیں۔ ایک نوعیت کی ضروریات یہ ہیں کہ کوئی اس کا پروردگار ہو، کوئی ملجا و ماوی ہو، کوئی دعاؤں کا سننے والا اور حاجتوں کا پورا کرنے والا جو جس کا مستقل سہارا اس عالم اسباب کے بے ثبات سہاروں کے درمیان رہتے ہوئے وہ تمام کے۔ سوا اوپر کے سوالات نے فیصلہ کر دیا کہ اس ضرورت کو پورا کرنے والا خدا کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دوسری نوعیت کی ضروریات یہ ہیں کہ کوئی ایسا رہنما ہو جو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے صحیح اصول بتائے اور جس کی پیروی پورے اعتماد و اطمینان کے ساتھ کی جا سکے۔ سو اس آخری سوال نے اس کا فیصلہ بھی کر دیا کہ وہ بھی صرف خدا ہی جو اس کے بنیاد و رہنما و ہر کی سوا کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی جس کی بنا پر انسان مشرک و مذہب اور لادینی اصول تمدن و اخلاق و دنیا و آخرت (حاشیہ صفحہ ۱۴۲) لے مینی جنھوں نے مذہب بنا مے جنھوں نے نفسے تصنیف کیے، اور جنھوں نے قوانین حیات تجزیہ کیے انھوں نے بھی یہ سب کچھ علم کی بنا پر نہیں بلکہ گمان و قیاس کی بنا پر کیا، اور جنھوں نے ان مذہبی اور دنیوی رہنماؤں کی پیروی کی انھوں نے بھی جان کر اور سمجھ کر نہیں بلکہ محض اس گمان کی بنا پر ان کا اتباع اختیار کر لیا کہ ایسے بڑے بڑے لوگ جب یہ کہتے ہیں اور باپ دادا ان کو مانتے چلے آ رہے ہیں اور ایک دنیا ان کی پیروی کر رہی ہے تو ضرور وہ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔

سے جو کچھ پہلے آچکا تھا اس کی تصدیق ہے، معنی ابتداء سے جو اصولی تعلیمات انبیاء علیہم السلام کی معرفت انسان کو بھیجی جاتی رہی ہیں یہ قرآن ان سے ہٹ کر کوئی نئی چیز نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ انہی کی تصدیق و توثیق کر رہا ہے۔ اگر یہ کسی نئے مذہب کے بانی کی ذہنی تخیل کا نتیجہ ہوتا تو اس میں ضرور یہ کوشش پائی جاتی کہ پرانی صداقتوں کے ساتھ کچھ اپنا نازگار رنگ بھی ملا کر اپنی شان و اقتدار نمایاں کی جائے۔ (باقی صفحہ ۱۴۳ پر)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو، اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس کو بلا سکتے ہو مدد کے لیے بلا لو۔ اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مال بھی ان کے سامنے نہیں آیا اُس کو انھوں نے (خواہ مخواہ اکل بچو) جھٹلادیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲) "الکتاب کی تفصیل ہے" یعنی ان صوری تعلیمات کو جو تمام کتب آسمانی کالب لباب (الکتاب) ہیں، اس میں پھیلا کر دلائل و شواہد کے ساتھ، متیقن و تفہیم کے ساتھ، تشریح و توضیح کے ساتھ، اور عملی حالات پر انطباق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(حواشی صفحہ ۱۴۲) عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ چیلنج محض قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کی ادبی خوبیوں کے لحاظ سے تھا۔ عجاظ قرآن پر جس اعزاز سے بخش کی گئی ہیں اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونی کچھ بعید نہیں ہے۔ لیکن قرآن کا مقام اس سے بلند تر ہے کہ وہ اپنی ایک نئی و بے نظیری کے دعوے کی بنیاد محض اپنے لفظی محاسن پر رکھے۔ بلاشبہ قرآن اپنی زبان کے لحاظ سے بھی لا جواب ہے، مگر وہ اصل چیز جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ انسانی دماغ ایسی کتاب تصنیف نہیں کر سکتا، اس کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہیں۔ اس میں اعجاز کے جو جو پہلو ہیں اور جن وجوہ سے اس کا من جانب اللہ ہونا یقینی اور ان کا ایسی تصنیف پر قیاد ہونا غیر ممکن ہے ان کو خود قرآن میں مختلف مواقع پر بیان کر دیا گیا ہے اور ہم ایسے تمام مقامات کی تشریح پہلے بھی کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کریں گے، اس لیے یہاں بخوف طوالت اس بحث سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

۷۔ تمکذیب یا تو اس بنیاد پر کی جاسکتی تھی کہ ان لوگوں کو اس کتاب کا ایک جعلی کتاب ہونا تحقیقی طور پر معلوم ہوتا یا پھر اس بنا پر کہ حقیقتیں اس میں بیان کی گئی ہیں اور جو خبریں اس میں دی گئی ہیں وہ غلط ثابت ہو جاتیں۔ لیکن ان دونوں وجوہ تمکذیب میں سے کوئی وجہ بھی یہاں موجود نہیں۔ نہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ از روئے علم جانتا ہے کہ یہ کتاب گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کی گئی ہے، نہ کسی پر وہ غیب کے پیچھے جھانک کر یہ دیکھ لیا ہے کہ واقعی بہت سے خدا موجود ہیں اور یہ کتاب خواہ مخواہ ایک خدا کی خبر سنار ہی ہے یا فی الواقع خدا اور فرشتوں اور وحی وغیرہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اس کتاب میں خواہ مخواہ یہ افسانہ بنا لیا گیا ہے، نہ کسی نے مر کر یہ دیکھ لیا ہے کہ دوسری زندگی اور اس کے حساب کتاب اور جزا و سزا کی ساری خبریں جو اس کتاب میں دی گئی ہیں غلط ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ترے شک اور لگان کی بنیاد پر اس شان سے اس کی تمکذیب کی جارہی ہے کہ گویا علمی طور پر اس کے جعلی اور غلط ہونے کی تحقیق کر لی گئی ہے۔